اللہ تعالیٰ کا دین
نوجوانوں سے کیا چاہتا ہے؟

مولانا سید جلال الدین عمری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ تعالیٰ کا دین

نوجوانوں سے کیا چاہتا ہے؟

[تحریکی نوجوانوں سے خطاب]

طالب علموں اور نوجوانوں کی اہمیت ہر زمانے میں رہی ہے۔ آج بھی ان کی بڑی اہمیت ہے، بلکہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ اہمیت ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے، جس کے ہاتھ میں جلد ہی ملک اور قوم کی باگ ڈور ہوگی۔ وہ اگر صحیح فکر اور صحیح سیرت کا حامل ہوگا تو پورے ملک کو صحیح راہ پر لے چلے گا اور اگر وہ فکری اور عملی بے راہ روی کا شکار ہوجائے تو پوری قوم اور ملک کا رُخ بھی غلط ہو جائے گا۔ نوجوان قوم کے معمار ہیں۔ ان سے اس کی قسمت وابستہ ہے۔ ان میں بعض ایسی خصوصیات ہوتی ہیں، جو بڑی

عمر والوں میں کم ہی پائی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی فکر و خیال کو قبول کرنے کی صلاحیت ان میں زیادہ ہوتی ہے۔ بڑی عمر کے لوگوں کو دور و نزدیک کی مصلحتیں اور بسا اوقات عصبیتیں کسی فکر کو قبول کرنے سے روک دیتی ہیں۔ نوجوانوں کے مضبوط عزائم ان زنجیروں کو کاٹ سکتے ہیں۔ ان کی راہ میں بالعموم وہ چیزیں رکاوٹ نہیں بنتیں جو بڑوں کی راہ کی رکاوٹ ہوتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان میں تازہ خون، نیا جوش اور ولولہ ہوتا ہے، اس لیے کچھ کر دکھانے کا حوصلہ اور اس کی قوت و صلاحیت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ان کی تیسری خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ جس چیز کو وہ صحیح سمجھیں اس پر عمل کر سکتے ہیں۔ کسی فکر کو حق سمجھنا اور اس کا تعاون نہ کرنا اور خاموش بیٹھے رہنا، نوجوانوں کے مزاج کے خلاف ہے۔ وہ اس کے لیے تکلیفیں اٹھا سکتے ہیں اور قربانیاں دے سکتے ہیں۔

ان ہی اسباب کی بنا پر نوجوان ہر تحریک کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ ان کو ہر تحریک اپنے ساتھ لینے اور ان سے طاقت حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ جب کسی تحریک میں جوانوں کی آمد رک جاتی ہے تو وہ ختم ہو جاتی ہے۔ دنیا میں جو بھی بڑے بڑے انقلاب آئے ان میں نوجوانوں کا ہاتھ رہا ہے۔ ان کی قربانیوں ہی نے انھیں کامیابی سے ہم کنار کیا ہے۔ انبیاءؑ کی تاریخ بتاتی ہے کہ نوجوانوں ہی نے سب سے پہلے ان کا ساتھ دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بندگیِ رب کی دعوت دی تو بعض نوجوانوں

نے آگے بڑھ کر اسے قبول کیا اور فرعون کے ظلم وستم کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾ (یونس:۸۳)

''موسیٰ کو فرعون کی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا۔ فرعون کے ڈر سے اور اپنی قوم کے سر بر آوردہ لوگوں کے ڈر سے۔ انھیں خوف تھا کہ فرعون ان کو عذاب میں ڈال دے گا، واقعہ یہ ہے کہ فرعون زمین میں غلبہ رکھتا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی حد پر رُکتے نہیں ہیں۔''

اصحابِ کہف نوجوان ہی تھے، جنھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اللہ کے دین کی خاطر اس دنیا کی زیب و زینت اور آسائش و راحت کو چھوڑا جاسکتا ہے اور اس کی حفاظت کے لیے غاروں میں پناہ لی جاسکتی ہے۔

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿۱۳﴾ ۖۗ وَّ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ﴿۱۴﴾ (الکہف:۱۳، ۱۴)

''وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔ ہم نے ان کے دل اس وقت مضبوط

کر دیے جب وہ اٹھے اور انھوں نے اعلان کر دیا کہ ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ اسے چھوڑ کر ہم کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے، اگر ہم ایسا کریں گے تو بالکل بے جا بات کریں گے۔''

نبی ﷺ کی تاریخ بھی بتاتی ہے کہ زیادہ تر جوانوں اور نوجوانوں ہی نے آپ کا ساتھ دیا۔ اولین صحابہ میں حضرت علیؓ سب سے کم عمر تھے، جن کی عمر نو سال سے لے کر گیارہ سال تک بتائی جاتی ہے اور بڑی عمر والوں میں حضرت ابو بکرؓ ہیں ان کی عمر زیادہ سے زیادہ اڑتیس سال تھی۔ دو ایک کے علاوہ بیشتر صحابہ کی عمریں اس سے کم ہی تھیں۔

موجودہ دور میں کوئی بھی اسلامی تحریک نوجوانوں کی طرف سے کبھی غفلت نہیں برت سکتی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ ان کے مسائل کو سمجھیں اور انھیں حل کرنے کی کوشش کریں۔ آج کے نوجوان جن مسائل سے دو چار ہیں، ان میں سے بعض کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔

۱- آج کا نوجوان ایک طرح کے ذہنی انتشار میں گرفتار ہے۔ اس کے سامنے کوئی راستہ ہے اور نہ کوئی منزل۔ طرح طرح کے اور متضاد نظریات نے اُسے ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ وہ ان نظریات کے درمیان حیرانی اور سرگشتگی کے عالم میں کھڑا ہے اور یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ ان میں سے کس کو اختیار کرے اور کس کا ساتھ دے؟ فکری لحاظ سے ان میں

سے کسی بھی نظریے میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ اس کے تمام مادی اور روحانی مسائل کو حل کر سکے۔ ایک پہلو سے وہ اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو دوسرے پہلو سے اسے بے اطمینانی کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہ صاف دیکھ رہا ہے کہ ان میں سے ہر نظریہ عملی لحاظ سے اس کے لیے سخت نقصان دہ اور تباہ کن ہے۔ وہ ان کا بری طرح استحصال کرتا ہے اور اس کی قوتوں اور صلاحیتوں سے غلط فائدہ اٹھاتا ہے۔ ان میں سے کسی میں بھی اسے اپنی بھلائی اور فلاح و کامیابی نظر نہیں آ رہی ہے۔

۲-اس وقت پوری دنیا اخلاقی بحران سے گزر رہی ہے۔ آج کا نوجوان بھی اسی بحران کا شکار ہے۔ اخلاقی اقدار انسان کو بعض اصولوں کا پابند بناتی ہیں اور اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ دنیا نے ہمیشہ ان اخلاقی اقدار کو دائمی قدر و قیمت رکھنے والے اقدار سمجھا ہے۔ ان کی خلاف ورزی کو وہ جرم تصور کرتی رہی ہے۔ لیکن موجودہ دور کے انسان کے نزدیک یہ اخلاقی قدریں ابدی نہیں ہیں۔ یہ سماج کی پیداوار ہیں اور سماج کے حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ اس لیے قدیم اقدار پر اصرار کرنا اور ان کی پابندی کو ضروری تصور کرنا، قدامت پرستی اور بے دانشی کی دلیل ہے۔ اس تصور کے ساتھ اخلاق کی دائمی اہمیت ختم ہو جاتی ہے اور آدمی جس اخلاقی قدر کو چاہے دورِ جاہلیت کی یادگار کہہ کر پامال کر سکتا ہے۔

اس وقت دنیا میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو زبانی طور پر اخلاقی اقدار کی مستقل اہمیت کے قائل ہیں لیکن عملاً ان کے نزدیک ان کی اتنی اہمیت نہیں ہے کہ ان کے لیے کوئی بڑا نقصان برداشت کیا جائے یا کسی حاصل ہونے والے فائدے کو چھوڑ دیا جائے۔ صداقت اور راست بازی ایک اعلیٰ اخلاقی قدر ہے۔ اس کی اہمیت کو وہ تسلیم کرتے ہیں لیکن کسی بھی چھوٹے سے چھوٹے فائدہ کے لیے وہ جھوٹ بول سکتے ہیں۔ یہی حال اور اخلاقی اقدار کا ہے۔ اس اخلاقی زوال کی وجہ سے کسی شخص کو کسی پر اعتماد باقی نہیں رہا ہے۔ ہر شخص دوسرے سے خوف محسوس کرتا ہے۔ آج کا نوجوان بھی اسی بے اعتمادی کی فضا میں جی رہا ہے۔ اسے نہ تو کسی کی دیانت، امانت، عہد و پیمان اور خلوص پر اعتماد ہے اور نہ کوئی دوسرا اس پر اعتماد کرنے کے لیے تیار ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اسے ایک ایسی دنیا ملی ہے جو بے اصول اور اخلاق سے محروم ہے۔ وہ یہاں بے اصولی اختیار کرکے ہی کامیاب ہوسکتا ہے، ورنہ اسے قدم قدم پر نقصان اٹھانا پڑے گا۔

۳- آج کا ایک بڑا فتنہ جنسی آوارگی ہے۔ دورِ جدید کے فلسفوں نے انسان کو حیوان کی سطح پر پہنچا دیا ہے۔ وہ حیوان کے نقطۂ نظر سے ہر مسئلے کو دیکھتا اور اسے حل کرنا چاہتا ہے۔ اسے وہ فطری نقطۂ نظر سمجھتا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ جنسی اباحیت پسندی کی شکل میں برآمد ہوا ہے۔ وہ حیوانوں کی طرح مکمل جنسی آزادی چاہتا ہے اور اس میں کسی قسم کی

رکاوٹ کو پسند نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک جنسی جذبات کو مذہب اور اخلاق کے نام پر دبانا غیر فطری اور نقصان دہ ہے۔ اس سے انسان کے ذہن و مزاج پر برا اثر پڑتا ہے۔ اس کے لیے اس نے جنسی جذبات کو ابھارنے والا پورا ماحول تیار کر رکھا ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبار و رسائل، گندے اشتہارات اور گندی کتابیں، غرض نشر و اشاعت کے تمام ذرائع اس ماحول کو بنانے اور ترقی دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ انسان کے اندر جوانی کے دور میں جنسی جذبات کا طبعی طور پر غلبہ رہتا ہے۔ موجودہ ماحول نے ان جذبات کو اور بھڑکا دیا ہے۔ آج کے نوجوانوں پر جنسی جنون سوار ہے اور کسی سنجیدہ کام سے انھیں دل چسپی نہیں رہ گئی ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ان جذبات کو کنٹرول کیا جاتا اور صبر و ضبط کی تعلیم دی جاتی اور اس کا عادی بنایا جاتا لیکن اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہے۔

۴۔ تعلیم کو موجودہ دور کی خرابیوں کا علاج سمجھا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ تعلیم جیسے جیسے عام ہوگی یہ خرابیاں دور ہوتی چلی جائیں گی۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم اصلاح کا ایک عمدہ ذریعہ ہے۔ اس سے انسان کو بنانے اور سنوارنے میں بڑی مدد ملتی ہے، لیکن موجودہ نظام تعلیم سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے کہ یہ ساری خرابیاں بڑی حد تک اسی نظام تعلیم کی پیدا کردہ ہیں۔ جس تعلیم نے پورے معاشرے کو مسموم بنا رکھا ہو، اسے تریاق سمجھنا بہت بڑی نادانی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج یہی تعلیم عام

ہو رہی ہے اور اس کے حاصل کرنے والوں کا اوسط بھی بڑھ رہا ہے۔ اگر اس سے موجودہ بگاڑ دور ہوسکتا تھا تو جس تناسب سے تعلیم پھیل رہی ہے اسی تناسب سے بگاڑ میں کمی آتی، لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ اس میں کوئی کمی نہیں آرہی بلکہ روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

موجودہ نظامِ تعلیم انسان کے اندر خالص مادی نقطۂ نظر پیدا کرتا اور اسے خودغرض اور ذاتی مفاد کا بندہ بناتا ہے۔ ہر معاملہ میں ذاتی مفاد اس کے سامنے ہوتا ہے۔ وہ اسی پہلو سے اسے دیکھتا اور اسی لحاظ سے عملی قدم اٹھاتا ہے۔ کم ازکم مشرقی ملکوں میں موجودہ نظام تعلیم آدمی کو قوم و ملک اور نوع انسانی کا خیر خواہ تو درکنار ایک اچھا شہری بنانے میں بھی ناکام ہے۔ اسی نظام تعلیم کے تحت آج کے طلبا اور نوجوانوں کی ذہنی وفکری تربیت ہو رہی ہے۔ وہ اسی کے زیر اثر پروان چڑھ رہے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ہمیں ایک ایسی نسل مل رہی ہے، جو صرف اپنی ذات کے لیے جی رہی ہے، اور جس کے سامنے کوئی اعلیٰ مقصد نہیں ہے۔

یہ حالات اور مسائل طلبا اور نوجوانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بیشتر حالات سے آج کا ہر فرد دو چار ہے۔ لیکن آپ نے طلبا اور نوجوان کو اپنا میدانِ کار مقرر کیا ہے، اس کے پیش نظر چند باتیں عرض کی جارہی ہیں۔

۱- موجودہ دور کی ساری خرابیوں کی بنیاد یہ ہے کہ انسان کے سامنے

کوئی اعلیٰ مقصدِ حیات نہیں ہے۔ مقصدِ حیات جتنا بلند اور پاکیزہ ہوگا اتنی ہی نیکیاں اور خوبیاں انسان کے اندر ابھریں گی اور وہ خامیوں اور کمزوریوں پر قابو پا سکے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ ایک اعلیٰ وارفع مقصدِ حیات رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے اس مقصد کا خود آپ کو گہرا شعور ہونا چاہیے۔ آپ کو یہ پورا یقین ہونا چاہیے کہ وہی ایک مقصد صحیح اور حق ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کے جتنے مقاصد ہیں یا ہو سکتے ہیں وہ سب کے سب غلط اور باطل ہیں۔ پھر آپ کی پوری زندگی پر اپنے مقصد حیات کی گہری چھاپ ہونی چاہیے۔ آپ کی ایک ایک حرکت اور عمل سے ظاہر ہونا چاہیے کہ آپ پر اسی مقصد کی حکم رانی ہے اور آپ کے تمام اعمال اسی کے تابع ہیں۔ آپ ان ہی امور میں دل چسپی لیں، جن کی اجازت آپ کا مقصد آپ کو دے اور ان تمام امور سے کنارہ کش ہو جائیں جو اس مقصد سے متصادم ہوں۔ آپ کے فکر وعمل پر وہ اس طرح چھا جائے کہ آپ کو دیکھنے والا ہر نوجوان یہ محسوس کرے کہ آپ کی زندگی نہ تو بے مقصد ہے اور نہ کسی چھوٹے اور کم تر درجے کے مقصد کو آپ نے اختیار کر رکھا ہے۔ ایک اعلیٰ مقصد کے لیے آپ کی تعلیم بھی ہے اور تربیت بھی۔ اسی کو غالب اور سر بلند کرنے کے لیے آپ سوچتے بھی ہیں اور تگ و دو بھی کرتے ہیں۔ آپ کو دیکھ کر یہ خیال ہرگز نہ ابھرنے پائے کہ دنیا کے بیشتر نوجوانوں کی طرح آپ بے مقصد زندگی گزار رہے ہیں۔ یاد رکھیے! بامقصد انسان ہی

دوسروں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جو انسان کسی مقصد کے لیے دوڑ دھوپ کرتا ہو، جس کے اوقات اور قوت و صلاحیت اس کے لیے صرف ہو رہے ہوں، اس سے دوسرا شخص، چاہے اختلاف کرے لیکن اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اگر اسے یقین ہو جائے کہ آپ بامقصد ہی نہیں صحیح مقصد کے حامل ہیں اور ایک پاکیزہ اور بلند منزل آپ کے سامنے ہے تو وہ آپ کا گرویدہ ہو جائے گا۔

۲- آپ جس مقصد کے حامل ہیں اس کا اپنے حلقہ احباب میں تعارف کرائیے اور مسلسل تعارف کرائیے۔ آپ کو جو بھی وقت ملے اسی کام میں صرف کیجیے۔ یہاں تک کہ آپ سے ملنے والا ہر شخص یہ سمجھ لے کہ آپ جس برتر مقصد کے تحت زندگی گزار رہے ہیں اسی کو دوسروں کی زندگی کا بھی مقصد دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت، دولت، علم اور صلاحیت جو کچھ بھی ہے اسے اسی کام میں لگائیے، پھر یہ کام نتائج سے بے فکر ہوکر انجام دیجیے۔ نتائج سے بے پروا ہوکر کام کرنا آسان نہیں ہے۔ انسان جب اپنی محنت کا نتیجہ آنکھوں کے سامنے نہیں دیکھتا ہے تو اسے مایوسی ہوتی ہے اور وہ ہمت ہار کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ کام اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ آدمی اسے اپنا فرض تصور کرے اور یہ سمجھے کہ مخاطب، چاہے میری بات قبول کرے یا نہ کرے، بہرحال مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے اور مخاطب کے انکار کی وجہ سے میرا فرض ساقط نہیں ہو جائے گا۔ اس جذبے کے ساتھ آپ کام

کریں گے تو آپ کی ہمت ٹوٹے گی اور نہ آپ پر مایوسی طاری ہوگی۔ ویسے یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ اسلام کی دعوت میں بڑی جان ہے۔ یہ انسان کی فطرت سے بالکل ہم آہنگ ہے۔ اگر فطرت مسخ نہ ہوئی ہو تو اس کا انکار ضمیر پر سخت گراں گزرتا ہے۔ صحیح الفطرت انسان اسے آسانی سے رد نہیں کرسکتا۔

بہت سے نوجوان اس کام کے لیے وقت کے نہ ہونے یا اس کی کمی کا عذر کرتے ہیں۔ حالاں کہ یہ کوئی معقول عذر نہیں ہے۔ ذہین سے ذہین اور محنتی سے محنتی طالب علم بھی تفریح اور کھیل کود کے لیے وقت نکالتا ہے، دوستوں کے درمیان بے تکلفی اور ہنسی مذاق میں بھی وقت صرف ہوتا ہے، تھوڑا بہت وقت غفلت کی بھی نذر ہو جاتا ہے۔ چھٹیاں بالعموم بے مقصد کاموں میں گزر جاتی ہیں۔ اگر آدمی اپنے ان ہی فاضل اوقات کو دعوت کے کام میں لگا دے تو بہت مفید نتائج برآمد ہوسکتے ہیں، جس شخص کے سامنے کوئی مقصد حیات ہو اور وہ اسے دوسروں تک پہنچانا بھی چاہتا ہو تو اپنے مصروف ترین لمحات میں بھی وہ اس کے لیے وقت نکال لے گا۔ مقصد حیات انسان کے ذہن و مزاج کو بدل دیتا ہے، اس کی دلچسپیوں کو بدل دیتا ہے، اس کے ترک و اختیار کے پیمانوں اور اس کی گفتگو کے موضوعات کو بدل دیتا ہے۔ وہی وقت جس میں لوگ ایک دوسرے کا مذاق اڑاتے ہیں، فلمی گانوں کے سننے اور ٹیلی ویژن کے گندے پروگرام

دیکھنے میں صرف کرتے ہیں، ہنسی مذاق اور ٹھٹوں میں گنواتے ہیں، سیر سپاٹوں اور تفریحوں میں ضائع کرتے ہیں، بامقصد انسان اسی کو اپنے مقصد کی تبلیغ کے لیے استعمال کرتا ہے اور ان موضوعات پر بحث اور گفتگو کے لیے استعمال کرتا ہے جو اس کے مقصد سے ہم آہنگ ہوں۔

یہاں ایک بات ذہن میں رہے۔ وہ یہ کہ تبلیغ و دعوت کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آپ اپنی تعلیم سے غفلت برتیں۔ اگر آپ طلبا میں کام کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ علم کے میدان میں اونچا مقام پیدا کریں۔ ایک طالب علم اسی طالب علم سے سب سے زیادہ متاثر بلکہ مرعوب ہوتا ہے جو پڑھنے لکھنے میں فائق اور برتر ہو۔ جو طالب علم تعلیم کے میدان میں پیچھے ہو اس کا دوسرے طالب علم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ خاص کر کسی سنجیدہ طالب علم کو اگر یہ محسوس ہو کہ ایک خاص تحریک سے وابستہ ہونے کی وجہ سے آپ تعلیم کے میدان میں پیچھے رہ گئے ہیں تو وہ آپ کے قریب نہیں ہوگا اور تحریک کے بارے میں بھی اس کی رائے خراب ہوگی۔

۳- اسلام نے شروع ہی سے عقائد و عبادات کے بعد جس چیز پر زیادہ زور دیا ہے، وہ اخلاق ہے۔ آپ قرآن مجید میں دیکھیں گے کہ اسلام جگہ جگہ ان اخلاقی اوصاف کو نمایاں کر کے دکھاتا ہے، جنھیں وہ انسان کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس کی پوری دعوت میں اخلاقیات اس طرح رچی بسی ہیں کہ ان کے بغیر اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ خود بھی ان

اخلاقیات کی پابندی کیجیے اور نوجوانوں کو بھی ان کا پابند بنائیے۔ ان کو لوگوں کی جان، مال اور عزت و آبرو کا محافظ اور پاسبان بنا کر کھڑا کیجیے۔ دنیا کی تحریکیں اپنے غلط مقاصد کے لیے غلط طریقے سے طلبا کو استعمال کرتی ہیں، وہ ان کو حدود و قیود سے آزاد کر دیتی ہیں، اپنے مخالفین کے خلاف بھڑکاتی ہیں، ان سے ہنگامے کراتی ہیں اور تخریب کے کام لیتی ہیں۔ لیکن آپ اس طرح کے کام نہ ان سے لے سکتے ہیں اور نہ آپ کو لینا چاہیے۔ آپ کو ان کے ذہن و فکر کو بنانا ہوگا۔ ان کو نیکی اور تقویٰ کی راہ پر لگانا ہوگا اور انھیں اس مقام تک پہنچانا ہوگا کہ وہ نیکی اور تقویٰ کے علم بردار بن جائیں۔

آخری بات یہ کہ آپ کا مقصد دنیا کی کامیابی نہیں آخرت کی کامیابی ہے۔ آپ کی ساری کوششیں اسی کے لیے ہیں۔ اس مادہ پرست دور میں آخرت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ آج کے نوجوانوں میں یہی تصور آپ کو پیدا کرنا ہے۔ بہ ظاہر یہ بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن انسان کے عزم کے سامنے کوئی مشکل، مشکل نہیں رہتی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس میں کامیابی عطا فرمائے۔

(یہ مضمون 'ملک وملت کے نازک مسائل اور ہماری ذمہ داریاں' میں بھی شامل ہے)